بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

اس مرتبہ چند مختلف، مگر نہایت درجہ اہم مسائل تقاضا کرتے ہیں کہ اِن اوراق میں اُن پر سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا جائے۔

(۱)

تازہ ترین حادثہ جس نے پورے ملک میں ایک فوری جذباتی ہیجان پیدا کر دیا ہے، بھارت کی حکومت کا یہ افسوسناک اقدام ہے کہ اُس نے دریائے ستلج کے پانی کی بہت بڑی مقدار بھاکڑا نہنگل کے سلسلۂ انہار میں منتقل کر لی ہے۔

پاکستان کی نہریں دریائے ستلج سے معمولاً جس مقدار میں پانی لے رہی تھیں وہ ۲۸ ہزار کیوسک سے لے کر ایک لاکھ کیوسک تک گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ یکم جولائی کو بھارت کے جارحانہ تصرّف کی وجہ سے یہ مقدار ۲۲ ہزار کیوسک تک آ گری، اور اب ۸ جولائی کو یکایک گھٹ کر یہ ۹ ہزار ۸ سو کیوسک رہ گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا سات ہزار میل لمبا سلسلۂ انہار بے آب ہو کر رہ گیا ہے جس پر منٹگمری، ملتان اور ریاست بہاولپور کی زمینوں کی زرخیزی کا انحصار تھا۔ تقریباً اسّی لاکھ ایکڑ کا وہ علاقہ جو غلّے اور کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے پاکستان میں درجۂ اوّل پر تھا ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بدلنے والا ہے۔ اور ہمارے پچاس لاکھ بھائی ہیں جنہیں بے روزگاری اور بھوک کے سامنے لا کھڑا کر دیا گیا ہے علاوہ بریں پاکستان کی غلّہ کی پیداوار ضرورت کے مقابلے میں جو کمی دکھا رہی تھی اس میں خوفناک اضافہ ہونا بالکل نمایاں ہے۔ واضح رہے کہ معاہدۂ تقسیم کے تحت واجبات اور املاک کا جو بٹوارا ہوا تھا اس میں پاکستان پنجاب کی نہروں کا حسابِ مجرا دے چکا ہے۔ گویا بھارت نے نہروں کی قیمت بھی وصول کر لی، اور اب پانی بھی اُڑس لیا۔

بین الاقوامی قانون اور روایات کے لحاظ سے اس طرح کے اقدامات اعلانِ جنگ کے مترادف قرار پاتے ہیں۔ اس طرح کے تصرفات کو کوئی مضبوط ملک برداشت نہیں کر سکتا اور کسی سرزمین کے شہری ایسی دراز دستیوں کو چپ چاپ گوارا نہیں کر سکتے۔ تقسیم کے بعد بھارت کی طرف سے حیدر آباد، جوناگڑھ اور کشمیر کے معاملے میں پے در پے جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان سب کے بعد یہ بہت بڑی کاری ضرب ہے جو پاکستان کی اقتصادی زندگی پر لگائی گئی ہے۔ یہ صریحاً ایک محاربانہ اقدام ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کی حکومت بھاکرا اسکیم سے فائدہ اٹھانے سے زیادہ پاکستان کو نقصان پہنچانا پیشِ نظر رکھتی ہے۔

یہ تلوار بہت دنوں سے ہمارے سروں پر لٹکی ہوئی تھی[1] لیکن ہمارے امن پسند لیڈروں کا اندازہ یہ تھا کہ چونکہ معاملہ ورلڈ بنک کی کمیٹی کے سامنے ثالثی اور سمجھوتے کے لیے جا چکا ہے اس لیے دیر سویر کسی طرح کا معاہدہ طے پا جائے گا اور خطرہ اتنے عرصہ کے لیے معلق ہو جائے گا کہ بیچ کے وقفے میں دوسری اسکیموں کو عمل میں لا کر پانی کی کمی کو پورا کیا جا سکے۔ مگر بھارت کی حکومت ایسی امن پسند کبھی نہ تھی کہ وہ ثالثی اور سمجھوتے کی کوششوں کے نتائج کا انتظار کرتی، اس نے انتہائی جسارت سے کام لے کر ستلج کا سارا پانی کاٹ لیا ہے۔ حالانکہ ابھی ہمارے اور بھارت کے نمائندے نیویارک میں غور و خوض کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے آخری فیصلے سے قبل بھارت کی حکومت ۱۹۵۲ء کے عارضی معاہدے کی پابند ہے۔ دنیا کو پنڈت نہرو کے اس خلافِ واقعہ اعلان نے حیرت میں ڈال دیا ہے کہ چونکہ ورلڈ بنک کی معرفت ہونے والی گفتگو ناکام ہو چکی ہے اس لیے اب بھارت اپنی اسکیم پر عمل پیرا ہونے کے لیے آزاد ہے۔ اس بیان کی تردید خود ورلڈ بنک کی طرف سے کر دی گئی ہے، لیکن بھارت اس کی پروا کیے بغیر ۱۹۵۲ء کے معاہدے کو پھاند چکا ہے۔

افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ورلڈ بنک کی جس کمیٹی سے منصفانہ ثالثی کی توقعات استوار کی

---

[1] درحقیقت اس مصیبتِ عظمیٰ کے بیج خود تقسیم کے فیصلے میں بو دیے گئے تھے اور ایک اہل قیادت کو بیجوں کے اندر ہی درخت دیکھ لینے چاہیے تھے، لیکن ۱۹۴۸ء میں آکر تو یہ بیج باقاعدہ کونپلیں نکال چکے تھے آخر یہ سارا نظام کیسے تیار کر دیا گیا۔

گئی تھیں اُس نے ان ساری توقعات کے خلاف ایسی صورتیں اختیار کی ہیں کہ بھارت کی بودی پوزیشن کو بے جا سہارا مل گیا ہے ۔ مثلاً :۔

——— پاکستان کے سامنے ستلج ، بیاس اور راوی کے پانی کا مسئلہ تھا، لیکن ورلڈ بنک کمیٹی نے چناب ، جہلم اور اٹک کے دریاؤں کے پانی کو بھی اسی میں شامل کرنے کے لیے مسئلے کو " دریائے سندھ کے طاس کا آبی تنازعہ " کا عنوان دے دیا ۔ اس طرح تنازعہ کی حدود وسیع تر ہو گئیں ۔

——— کمیٹی نے اپنی تجاویز اس رائے پر استوار کی ہیں کہ ستلج ، بیاس اور راوی کا پانی اگر انڈیا لے لے تو اس کمی کو پاکستان چناب ، جہلم اور اٹک کے فالتو پانی سے پورا کر سکتا ہے ۔ حالانکہ ان دریاؤں کا پانی اس وقت بھی پورے زمانۂ ربیع میں اور خریف کے بعض حصوں میں بالکل ناکافی ہوتا ہے اور بمشکل اس کی کو دوسرے دریاؤں سے پورا کیا جاتا ہے ۔ یہ خلاف واقعہ رائے بھی پاکستان کے خلاف پڑی ہے ۔

——— کمیٹی نے راجستھان کے بھارتی علاقے کو دریائے سندھ کے طاس سے متعلق قرار دے دیا ہے ، حالانکہ فی الحقیقت اس کی آبپاشی گنگا اور جمنا سے با آسانی کی جا سکتی ہے ۔ یہ چیز بھی انڈیا کے حق میں گئی ہے ۔

——— گفت و شنید کے طے شدہ خطوط میں یہ بات شامل تھی کہ تنازعہ کو سیاسی زاویۂ نظر سے نہیں ، بلکہ انجینئرنگ کے لحاظ سے دیکھا جائے گا ، لیکن کمیٹی نے خود ہی انجینئرنگ کے معیار کو ترک کر کے سیاسی طرزِ فکر اختیار کر لیا ہے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری پرانی تاریخی نہروں کا پانی انڈیا کو تو تعمیر نہری سلسلے کے لیے لینے کا حق دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف پاکستان کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ کئی کروڑ کی لاگت اور کئی سال کی محنت سے باہم دگر مربوط بندوں کا ایک وسیع سلسلہ تعمیر کرے ، درآنحالیکہ ان بندوں کے سلسلہ کا آغاز کشمیر کے اس علاقے ہی سے ہو سکتا ہے جو بھارت کے قبضے میں ہے ۔

——— طے پایا تھا کہ پانی کی تقسیم کا تناسب دونوں ملکوں کے اُن زیرِ کاشت رقبوں کے تناسب سے ہو گا جو دریائے سندھ کے طاس کی حدود میں آتے ہیں ۔ اس لحاظ سے بھارت کے حصے

میں پانی کی جملہ مقدار کا ۳ فیصد آتا ہے، لیکن اسے کمیٹی ۲۰ فیصد پانی لینے کا استحقاق دے رہی ہے۔

——— اب بنک کی طرف سے بیان دیا گیا ہے کہ تسلیج سے بھارت کے پانی لے لینے کے نتیجے میں پاکستان کو دو ماہ تک کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔ گویا پاکستان کی رائے عام اور بین الاقوامی ماحول کو مطمئن کیا جا رہا ہے۔

اس رنگ ڈھنگ کی ثالثی نے معاملہ یہاں لا پہنچایا ہے کہ پاکستان کے میلوں لمبے علاقے میں فصلوں کو تو درکنار، آدمیوں تک کو پینے کا پانی مشکل سے ملے گا۔

اب ملک میں اضطراب کی ایک لہر اس سرے سے اُس سرے تک دوڑ گئی ہے۔ مگر اس اضطراب سے نکلنے کی راہ کیا ہے؟ کیا ایک یوم ماتم؟ ایک احتجاج؟ لیڈروں کے چند جوشیلے بیانات؟ اخبارات کے تند و تیز نوٹ؟ پارلیمنٹ میں اس موضوع پر ایک گرما گرم بحث؟ کابینہ کے خفیہ اجلاسوں میں غور و خوض اور پیہم غور و خوض؟ ——— اور پھر کہ وہی ثالثی، وہی دہائی، وہی استغاثہ؟ یا کچھ اور؟

ہم مانتے ہیں کہ جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے گفت و شنید اگر کارگر ہو سکے اور ثالثی اگر موثر ثابت ہو تو اس سے زیادہ پسندیدہ تدبیر اور کوئی نہیں۔ لیکن تجربہ گواہ ہے کہ گفت و شنید اور ثالثی کا معرکہ میز پر بھی وہی لوگ جیتتے ہیں جو اپنے پیچھے مضبوط قوت رکھتے ہوں اور جو اگر ایک مرتبہ "ورنہ ——" کا لفظ زبان پر لائیں تو فضا جھرجھری لے لے۔ واعدوا لھم ما استطعتم کا منشا یہی نہ تھا کہ بات بات پر لڑائی چھیڑی جائے بلکہ یہ بھی تھا کہ یہ حالت پُرامن تدابیر اور مصالحانہ مساعی کی کامیابی کے لیے بھی لازم ہوتی ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری قوتِ بازو کم نہیں ہے، بلکہ اتنی مضبوط ہے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کیا جائے۔ لیکن اسے مضبوط تر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے لیڈر داخلی جوڑ توڑ اور سازشوں سے بالاتر ہو کر اجتماعی مفاد کی مخلصانہ خدمت پر کمربستہ ہوں، وہ جمہور کو اسلامی شعور اور جذبہ سے مالا مال کریں، وہ رائے عام کو ایک ایک مسئلے میں ٹھکراتے چلے جانے کے بجائے اسے گلے لگائیں، اور ہر اختلاف کرنے والے کے خلاف تشدد کے ہتھیار سے کر ملکی سیاست کے میدان میں اترآنے کی کمزوری

کو ترک کر دیں۔ یہ تبدیلیاں پوری قوم کو بھی، اور خود ہمارے معاملات کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے والے اکابر کو بھی حریف قوتوں کے مقابلے میں قوی بنائیں گی۔ ورنہ اگر بڑے لوگ آپس میں بھی کھینچا تانی میں مصروف ہوں، رائے عام کو بھی کچوکے دے رہے ہوں، اپنے ملک کی منظم اور کام آنے والی طاقتوں کو اختلاف کی سزا دینے میں مصروف ہوں تو قوم ہی کمزور نہیں ہوتی، بڑے لوگ خود بھی کمزور ہو جاتے ہیں، اور کمزوری جس طرح جنگ کے میدان میں خطرناک ہوتی ہے، گفت و شنید کی مجالس میں بھی ویسی ہی خطرناک ہوتی ہے۔ ان پہلوؤں سے گذشتہ سات برس میں جو کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں، یہ انہی کا نتیجہ ہے کہ بھارت کی حکومت ہمارے خلاف نت نئے جارحانہ اقدامات کر رہی ہے۔ اب بھی اگر ان کوتاہیوں کی تلافی کا فیصلہ کر لیا جائے تو ہرے ہوئے داؤں واپس جیتے جا سکتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ حکومت پاکستان کو بھارت کے ظلم سے بچانے کے لیے جو بھی موثر اقدام تجویز کرے گی، ملک کی تمام پارٹیاں اور عناصر اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس کا ساتھ دیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب کو اعتماد میں لے کر کوئی قدم اٹھایا جائے۔ یہ معاملات اب تنہا مسلم لیگ کے بس کا روگ نہیں رہے۔

---

(۲)

مولانا مودودی کے بارے میں حکومت کا پُراسرار سکوت تادمِ تحریر جاری ہے۔

مارشل لاء کے قیدیوں کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ایبٹ آباد کے جلسے میں امیر جماعت نے فرمایا تھا کہ حکومت کے سامنے قابلِ عمل صورتیں صرف تین تھیں:۔

ایک یہ کہ مارشل لاء کے سارے کے سارے قیدیوں کو اس دور کے گذرتے ہی فوراً چھوڑ دیا جاتا یہ صورت دنیا بھر کی مسلّمہ اور زیرِ عمل روایات کے مطابق ہوتی۔ مارشل لاء کے ہنگامی دور میں غیر معمولی نوعیت کی سخت کارروائیاں لمبی چوڑی تحقیق کے بغیر عمل میں لائی جاتی ہیں اور ہزاروں افراد ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، اور چونکہ ان کارروائیوں کا اصل مقصد نظم و قانون کو از سرِ نو استوار کر کے حالت

پیدا کر دیتا ہوتا ہے، انتقام و تعزیر کا محرک ان میں شامل نہیں ہونے دیا جاتا، اس لیے دنیا کی مہذب حکومتیں مارشل لاء اُٹھتے ہی اس کی سزاؤں کو ختم کر دیتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ تمام سزاؤں کو جاری رکھا جاتا۔ یہ صورت اگرچہ جمہوری ممالک کی روایات کے بالکل خلاف ہوتی اور اپنی حکومت کے ہاتھوں اپنی ہی رعایا کے خلاف یہ طرزِ معاملہ ظالمانہ ہوتا، تاہم حکومت اپنے وقار (PRESTIGE) کی خاطر ایسا کرتی تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ ایک طے شدہ ہمہ گیر پالیسی ہے چاہے وہ کتنی ہی گھٹیا نوعیت کی کیوں نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ سزا یافتگان کو حق دیا جاتا کہ وہ ملکی عدلیہ کے سامنے اپیل لے جائیں۔ اس طرح باقاعدہ عدالتی تحقیقات عمل میں آتی اور عام قانون کے تحت جن کے خلاف جرائم ثابت ہو جاتے ان کے لیے معتدل درجے کی سزائیں نافذ ہوتیں اور جن کا مجرم ہونا ثابت نہ ہو سکتا ان کو بری کر دیا جاتا۔ اس صورت میں کہا جا سکتا تھا کہ حکومت صرف انصاف کرنا چاہتی ہے اور قانون کے وقار کو مستحکم بنانا چاہتی ہے

لیکن حکومت نے ان تینوں جائز اور معقول صورتوں کو چھوڑ کر دنیا بھر سے نرالی ایک چوتھی راہ نکالی وہ یہ کہ پہلے تو انڈمنٹی ایکٹ کے ذریعے مارشل لاء کی تمام سزاؤں کو قانونی حیثیت سے مستقل بنا دیا پھر اسی ایکٹ میں یہ بات بھی رکھ دی کہ مارشل لاء کے سزا یافتگان اگر چاہیں تو مرکزی حکومت کو اپنی سزا کے خلاف عرضی پیش کر سکتے ہیں، ایسی کسی عرضی کے موصول ہونے پر حکومت شخص متعلقہ کا کیس بطور خود مرتب کر کے فیڈرل کورٹ کے ایک جج کے سامنے پیش کر دے گی۔ یہ ساری کارروائی سزا یافتگان کے علم سے بالا بالا ہی ہوگی اور وہ حکومت کے پیش کردہ کیس کو معلوم کر کے اس کی کوئی صفائی اصالتاً یا وکالتاً پیش نہیں کر سکیں گے، اس خفیہ طریقے سے جج کی رائے معلوم کرنے کے بعد حکومت اس رائے کے مطابق سزا کو بحال رکھ سکتی ہے، اس میں کمی کر سکتی ہے، یا اسے بالکل ختم کر سکتی ہے۔

سوچیے، کیا یہ صورت اسلام کے معیارِ عدل پر، یا کم سے کم موجودہ دنیا کے مسلمہ اصولِ انصاف پر کسی درجہ میں بھی پوری اترتی ہے؟

مگر اکتفا اسی پر نہیں کیا گیا کہ مارشل لاء کا جو قیدی عرضی دے اس کے معاملے کو زیرِ غور لایا جائے

اور جو نہ دے اس کو پڑا رہنے دیا جائے، نہیں، حکومت نے خود بھی یہ اختیار حاصل کر لیا کہ عرضی نہ دینے والے قیدیوں میں سے جس کا معاملہ بھی چاہے وہ بطور خود پیش کر دے گی۔

لیکن ایکٹ کے دیئے ہوئے اختیارات کی حد یہیں ختم نہیں ہو جاتی، مزید ایک دفعہ کے ذریعے حکومت اس کی مجاز ہے کہ وہ جسے چاہے، بغیر اس کا کیس فیڈرل کورٹ کے کسی جج کے سامنے رکھے رہا کر دے۔

اب، ایکٹ کی وہ مخصوص، پیچ در پیچ ساخت ہم نے مجملاً بیان کر دی ہے جس کے ہوتے ہوئے قانون کا تقاضا مسلم لیگی وزراء اور عمّال کے ذاتی اور گروہی اور سیاسی رجحانات کے تقاضوں میں بالکل حل ہو کے رہ جاتا ہے۔ یہی وہ ساخت تھی جس کو معیارِ عدل سے ہٹا ہوا پا کر مولانا مودودی نے اپنے معاملے پر نظرِ ثانی کرانے کی درخواست دینے سے انکار کر دیا اور ساری عمر جیل میں گذار دینے کو اس پر ترجیح دی۔ بعد کے حالات نے واضح کر دیا کہ مولانا مودودی کا اندیشہ بالکل بجا تھا اور جس اصول پسندانہ مسلک کو موصوف نے اختیار کیا، وہی اختیار کیے جانے کے قابل تھا۔

اب یہ طرفہ ماجرا دیکھ لیجیے کہ ۵۳ء کے سارے ہنگامے میں اگر کوئی مجرم اور تشدد کا گنہ گار مسلم لیگی اقتدار کو ملا تو صرف مولانا مودودی کی ذات تھی، یا پھر عبدالستار خاں نیازی کی! کیسی دلچسپ صورت ہے کہ جن قادیانی حضرات کو مارشل لاء کی عدالتوں سے سزائیں دی گئیں وہ تو چند روز کے اندر اندر آناً فاناً جیل سے باہر آ گئے، اور بعد میں آہستہ آہستہ مجلسِ عمل کے ارکان اور تحریکِ راست اقدام کے لیڈر اور سرگرم کارکن، حتیٰ کہ تشدد کی کارروائیوں کے الزام میں سزائیں پانے والے بھی تمام کے تمام رہا ہو گئے، اب قانون اور انصاف کا سارا تقاضا پورا کرنے کے لیے، اور حکومت کی دھاک باندھے رکھنے کے لیے اور فوج کے وقار کی بحالی کے لیے مولانا مودودی اور خان نیازی ہی تختۂ مشق بننے کو باقی رہ گئے ہیں۔

واضح رہے کہ اس سلسلے میں مارشل لاء، اس کی نوعیت، اس کے تحت مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے کارکنوں کی گرفتاری اور املاک اور حسابات پر ہاتھ صاف کرنے کے واقعات، فوجی عدالت کے مقدمے کی کارروائی کی تفصیل، انڈمنٹی ایکٹ کی مخصوص ساخت اور شروع سے اب تک کی حکومت کی پالیسی کے خم و پیچ اس ملک کے عوام پر پوری پوری طرح واضح ہو چکے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت

یہ ہے کہ رائے عام ـــــ اور ہر طبقے اور ہر عنصر کی رائے عام ـــــ نے ایک ایک مرحلے میں ملک گیر پیمانے پر اپنے تاثر کا اظہار احتجاج کی صورت میں کیا ہے۔ جلسے، قراردادیں، تار، محضر نامے، وفود، مظاہرے، اخبارات کے نوٹ، مساجد کی دعائیں، ہر طرف سے ایک سیلاب کی طرح امڈتی رہی ہیں اور سنجیدہ، باوقار، پُرامن اور جمہوری تدابیر جو بھی ممکن العمل تھیں ان میں سے بیشتر کے ذریعے پاکستان کے شہریوں نے اپنے جذبات مولانا مودودیؒ کے معاملے میں سینہ کھول کر حکمران طبقے کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ دلیل کے میدان میں مسلم لیگی اکابر کی پالیسی پوری طرح شکست کھا چکی ہے۔ آج آپ کسی کوردہ میں چلے جائیے اور کسی ان پڑھ غیر سیاسی دیہاتی بڈھے کو ہل چلاتے ہوئے روکیے، کسی بچے کو مٹی کے گھروندے بناتے ہوئے پکارئیے، کسی عورت کو دودھ بلوتے ہوئے جا کر پوچھیے کہ مولانا مودودی کے معاملے میں حکومت کا رویہ انصاف کا رویہ ہے یا زیادتی کا؟ ـــــ اس کے جواب میں آپ صرف "ظلم! ظلم!!" کی ایک ہی آواز ہر کسی سے سنیں گے۔ آپ مزید کریدیئے تو اس ملک کا عامی آدمی بھی آپ کو بتا دے گا کہ مولانا مودودی کا قصور اسلامی دستور کی تحریک چلانا ہے۔ یوں نہیں، تو پھر ہم چیلنج کرتے ہیں کہ آپ کے چوٹی کے لوگ کسی شہر، کسی علاقے میں آئیں اور ایک جلسۂ عام بلا کر مولانا مودودی کے خلاف اپنا کیس پیش کریں اور جماعت اسلامی کے کسی معمولی کارکن کو جوابی تقریر کا موقع دیں، پھر وہ رائے شماری کر لیں کہ لوگ کس کے دلائل کو وزن دیتے ہیں۔ بلکہ جوابی تقریر کا موقع اگر نہ بھی دیا جائے تو بھی ہمارا اندازہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم و شعور سے صحیح نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔

اب آگے صرف دھاندلی کا میدان باقی ہے جس کے ہاتھوں میں اختیارات ہوتے ہیں وہ جب دلائل سے ہر طرف سے تنگ ہو جاتا ہے تو قوت کے لٹھ کو حرکت میں لے آتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہی لٹھ آپ کو چلانا ہے تو آپ کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ چلا دیکھیے، مگر یقین جانیے کہ جس لٹھ کی حرکت دلائل کی بنا پر اپنا جواز عوام کے سامنے ثابت نہ کر سکی ہو، اس کے وار سے چوٹ تو کسی مظلوم ہی کو لگتی ہے مگر اس چوٹ کا بہت زیادہ درد خود لٹھ چلانے والے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دلیل کی سرحد چھاندنے کے بعد سیاسی انتقام کا میدان سامنے آجاتا ہے، اور سیاسی انتقام کو کتنی ہی مقدس نقابیں اوڑھائیے، دنیا کی نگاہ اس کے انداز قد کو بخوبی پہچانتی ہے۔

مولانا مودودی کے خلاف آپ جو چاہیں کیجئے، لیکن ایک بار پھر یہ حقیقت سمجھ لیجیے کہ مولانا مودودی ہے کون ؟

یہ وہ شخص ہے جس نے اس دورِ الحاد میں خالص عقلی اسلوب سے اسلام کے عقیدوں، اس کے اصولوں، اس کی فلسفے، اس کے قوانین وضوابط، اس کی اخلاقی قدروں، اس کی تہذیبی روایات اور اس کے آداب و شعائر کو نکھار کر پیش کیا ہے۔ اس نے اسلام کو جامد مذہب کی سطح سے اٹھا کر اجتماعی دین اور انقلابی تحریک کی صورت میں اجاگر کر دیا ہے۔ اس نے متزلزل ایمانوں کو از سر نو مستحکم کر دیا ہے، اس نے اکھڑے ہوئے دلوں کو دوبارہ جما دیا ہے، اس نے الجھے ہوئے دماغوں کی ساری گرہیں کھول دی ہیں۔ اس نے نئی امنگیں اور نئے جذبات دیئے ہیں۔ اس نے زندگی کے یخ بستہ سمندر میں حرکت پیدا کی ہے۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے جس کا پیغام ہزاروں دلوں میں اس طرح اُتر گیا ہے کہ اس نے زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے، لوگوں کے دل و دماغ بدل گئے ہیں، لوگوں کے اخلاق کی کایا پلٹ گئی ہے، لوگوں کی دوستیوں اور دشمنیوں کی سمتیں تبدیل ہو گئی ہیں، گھروں کے گھر ہیں کہ جن کی تہذیب اور جن کا کلچر نئے سانچوں میں ڈھل گیا ہے۔ نوجوان ہیں جو کل تک خدا اور مذہب کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن آج اسی خدا کے جاں نثار بندے اور اس کے مذہب کے اصولوں کے لیے دن رات جانفشانیاں کرنے والے ہیں۔ اونچے دل و دماغ جو کل تک کمیونزم کے علمبردار تھے آج اسی کے خلاف معرکہ آرائی میں پیش پیش ہیں۔ خواتین ہیں کہ جن کی جنت نظر اگر کل تک مغربی طرز کی زندگی تھی تو آج ان شمع ہائے خانہ کی کرنوں سے کتنے ہی خاندانوں میں اسلامی ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ طلبا دیکھیں کہ جنہیں آپس کی دھڑے بندیوں اور سیاسی لیڈروں کے اشارے پر ہنگامہ آرائیوں سے فرصت نہ ملتی تھی، آج اپنے آپ کو ایک اسلامی نظام کے کل پُرزے بنانے کے لیے ذہنی و اخلاقی تیاری میں مصروف ہیں۔ ادیب ہیں کہ جو کل تک دولت اور شہرت کی طلب میں اخلاق سوز تفریحی نگارشات کی تخلیق میں دماغی قویٰ کو برباد کر رہے تھے، آج ان کے قلم خدا اور رسول کی امانت بن گئے ہیں۔ تاجر اور وکیل بدلے ہیں، سرمایہ دار اور مزدور بدلے ہیں، زمیندار اور کسان بدلے ہیں، عالم اور اَن پڑھ بدلے ہیں، شہری اور دیہاتی بدلے ہیں ـــــ اور آئے دن اس شخص کی دعوت یہ انقلابی عمل دکھا رہی ہے۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے جو ایک کتابی اور خطابتی پیغام دے کر ہی نہیں رہ گیا۔ اُس نے دین کے لیے ایک تحریک بپا کر دی ہے۔ اس نے ایک تنظیمی طاقت پیدا کر دی ہے۔ اس نے سیاست کے اطوار کو نیا رنگ دیا ہے۔ اس نے اجتماعات اور جلسوں کو نئی فضا دی ہے۔ اُس نے تقریروں کو نیا مزاج دیا ہے۔ اس نے انتخابات کے لیے اسلامی اصولوں پر ایک نئی پالیسی مرتب کر کے تجربے کے میدان میں ڈال دی ہے۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے جو ایک بے داغ سیرت کا مالک ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ دنیا سے مخفی نہیں، نہ اسے کسی گوشے کو مخفی رکھنے کی کبھی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔ وہ نہ کسی قیمت پر بکنے والا ہے اور نہ کسی ڈراوے سے ڈرنے والا ہے۔ وہ عیارانہ جوڑ توڑ سے منزلوں بلند ہے۔ وہ مفاد کی بازیاں کھیلنے سے کوسوں دُور ہے۔ وہ اغراض کے مُہرے لڑانے سے کاملاً پاک دامن ہے۔ اسے آپ نے مختلف الزامات کا ہدف بنایا مگر کوئی الزام اس کے قامت پر راست نہ بیٹھا، آپ لوگوں نے اس کے خلاف شبہات پھیلائے مگر اس کی سیرت پر کوئی شبہ چپک نہ سکا، آپ نے گالیاں دیں لیکن کوئی گالی اس پر پھب نہ سکی آپ نے اسے ابتلاء کی انتہائی کٹھن وادیوں سے گذارا مگر کہیں اس نے ہمت نہیں ہاری آپ نے اسے گرم ترین بھٹیوں میں ڈالا مگر وہ ہر بار زرِ خالص بن کر نکلا۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے کہ لوگ جس کی علمی رفعت سے مرعوب ہی نہیں، اس کے کیرکٹر سے متاثر بھی ہیں۔ صرف متاثر ہی نہیں، اس کے احسان مند بھی ہیں۔ احسان مندی کا صرف اعتراف ہی نہیں کرتے، اس سے گہری محبت بھی کرتے ہیں۔ اور اس سے محبت کرنے والوں کا حلقہ پاکستان تک ہی محدود نہیں، تمام مسلم ممالک بلکہ یورپ کے بڑے بڑے شہروں تک بھی پھیلا ہوا ہے۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے جس کا لٹریچر گھر گھر میں موجود ہے، جس کے ملنے والے شہر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں، جس سے خط و کتابت کرنے والے گاؤں گاؤں میں موجود ہیں، جس کی فکر اجتماعی ذہن کے رگ و ریشہ میں اتر گئی ہے، جس کی اصطلاحات آج نادانستہ طور پر اس کے مخالفین کی تحریر و تقریر میں بھی گھُل مل گئی ہیں۔

ایسے شخص کے "جرم" کو بھی لوگ جانتے ہیں، اس کے مخالفین اور اس کے حریفوں کے طرزِ معاملہ

کی حقیقت بھی لوگ سمجھتے ہیں، اور اس کو دی جانے والی سزا کے معنی بھی جانتے ہیں۔

ایک بار اچھی طرح سوچیے کہ ایسی بلند مرتبت تاریخی شخصیت کے نہ تو قارکو آپ کم کر سکتے ہیں، نہ اس کی عزت گھٹا سکتے ہیں، نہ اس کی محبوبیت و مقبولیت کا دائرہ سکیڑ سکتے ہیں اور نہ اس کے پیغام کے جادو کو توڑ سکتے ہیں۔ اس کے سامنے آپ کے طبقے میں سے کتنے ہی اکابر اُبھرے اور سال دو سال اپنے طنطنے دکھا کر زمانے کے حافظے کی بالکل نچلی تاریک تہوں میں جا ڈوبے لیکن مودودی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا جا رہا ہے۔

یہ بھی سوچیے کہ لوگ مولانا مودودی کی رہائی کا مطالبہ محض اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ایک مذہبی یا سیاسی لیڈر ہے۔ بلکہ وہ اس کی ذات کو "اسلامی دستور"، "اسلامی تحریک" اور "اسلامی نظام" کا ایک نشانِ محسوس تسلیم کرتے ہیں۔ وہ مولانا مودودی کے الفاظ سے گوشت اور ہڈیوں کا ایک پیکر مراد نہیں لیتے بلکہ ان کا مفہوم ہوتا ہے "دین کو غالب کرنے کی جدوجہد"، ان کے تصور میں چمک اٹھتے ہیں "اسلامی مملکت کے ۲۲ اصول"، ان کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہو جاتا ہے "قادیانی مسئلہ"، ان کا تخیل دیکھنے لگتا ہے "تفہیم القرآن" کے اوراق کو!

یہ ہے مودودی!

اس کے ساتھ آپ کو جو کچھ کرنا ہے ان ساری حقیقتوں کو خوب سمجھ کر کیجیے! آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیوں جگہ جگہ سے مودودی کی سزا کے خلاف رائے عام کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں، کیوں اتنا اضطراب پھیلا ہوا ہے، کیوں شہر شہر مظاہرے ہونے ہیں اور کیوں جگہ جگہ لوگ آپ کا دامن تھام تھام کر پوچھنے لگے ہیں کہ مولانا مودودی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھو گے۔

ان ہمہ گیر عوامی جذبات کو آپ نے پنجاب کے شہروں اور اضلاع میں دفعہ ۱۴۴ لگا کر، امیر جماعت کی زبان بندی کر کے اور تشدد کی مختلف تدبیریں عمل میں لا کر اپنی طرف سے دبا دیا ہوگا لیکن خیر خواہانہ گذارش یہ ہے کہ چیخیں اسی طرح لہریں لے رہی ہیں اور جب مضطربانہ جذبات پر اظہار کے دروازے اور پوری تدبیروں سے بند کر دیئے جائیں تو حالت وہی ہوتی ہے جیسے درد و کرب سے تڑپنے والے کسی مظلوم زخمی کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں۔ عوام سے یہ سلوک کبھی اچھے نتائج نہیں دے سکتا!

(۳)

ہمارے ارباب اختیار قوم کے ایک ایسے عنصر سے تعلق رکھتے ہیں جسے ہر دعوت اور ہر تحریک کسی نہ کسی درجے میں گوارا ہو سکتی ہے، لیکن اسلامی نظام کی دعوت اور اسلامی تحریک کی پکار ٹھنڈے پیٹوں ہرگز ہرگز گوارا نہیں۔ وہ اس کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے ہیں، غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے طومار اُن کے ذہنوں میں بھرے پڑے ہیں، اس دعوت کو بدنام کرنے والی اصطلاحات ان کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں، اس کے خلاف غیظ و غضب کا طوفان ہے جو دلوں میں اٹھتا رہتا ہے۔

آخر کیوں؟ محض اس لیے کہ یہ دعوت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اُن سے ہمہ گیر تبدیلیوں کا مطالبہ کرتی ہے، یہ فکر و نظر کے پیمانے بدل دینا چاہتی ہے، یہ سیرت و کردار کی بنیادوں کو بانداز دگر قائم کرنا چاہتی ہے، یہ معاشرتی مرتبوں کی موجودہ غلط ترتیب کو تہ و بالا کرنے کا داعیہ رکھتی ہے، یہ حقوق و فرائض کی غیر منصفانہ تقسیم کو جوں کا توں برقرار نہیں رہنے دے سکتی۔ دوسری سطحی دعوتوں اور سیاسی جتھہ بندیوں میں صرف بولیاں بدلنی پڑتی ہیں، لیکن یہاں بولی کے ساتھ ساتھ زندگی بدلنی پڑتی ہے۔ ہمارے قومی بزرگ ایسے اسلام کو تو سر آنکھوں پر لینے کو تیار ہیں جس کے لیے صرف ایک نئی بولی بول دینے سے کام چل جائے، لیکن وہ اسلام جو عمل و کردار کا نقشہ بدلنے کا تقاضا بھی کرے اسے یہ پاکستان کے مفاد کے لیے ایک مہلک خطرہ تصور کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی اسی عملی اور اجتماعی اسلام کی دعوت کو لے کر اٹھی ہے۔ اس کا یہی وہ قصور ہے جس کی گوناگوں سزائیں گذشتہ سات برس کے ایک ایک سیکنڈ میں اس نے بھگتی ہیں، اور ابھی بڑی بڑی دھمکیاں اس کے سامنے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی دعوت، اس کے کام اور اس کے پروگرام کے کسی جزء پر معقولیت اور استدلال اور انصاف کے میدان میں کوئی کھلا کھلا حملہ کبھی ممکن نہیں ہوا۔ اس پر جتنے بھی وار ہوئے ہیں عقلی اور نقلی نوعیت کے ہیں۔ اس پر جب بھی کوئی دراندستی کی گئی ہے تو جھوٹے پروپیگنڈے اور غلط الزامات کی آڑ میں کی گئی ہے۔ آج تک جن الزامات کو یکے بعد دیگرے جماعت اسلامی پر تشدد کرنے کا بہانہ بنایا جاتا رہا ہے وہ علی الترتیب یہ ہیں:۔

——— چونکہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کا ساتھ نہیں دیا، لہٰذا یہ جماعت پاکستان کی وفادار نہیں ہو سکتی، اور اب اس کی ساری سرگرمیاں پاکستان دشمنی پر مبنی ہیں۔

——— اس جماعت نے جہاد کشمیر کو حرام کہا اور اس کی مخالفت کی۔

——— اسے نہرو کی حکومت کی طرف سے روپیہ ملتا ہے۔

یہ ہتھیار دیر تک خوب خوب استعمال کیے گئے، لیکن آخر یہ کند ہو کر رہ گئے۔ اب نئے ہتھیاروں کی ضرورت پیش آئی تو فوقِ ایجاد رکھنے والوں نے ایک نیا شوشہ گھڑ دیا۔ یہ کہ جماعت اسلامی کو امریکہ سے روپیہ ملتا ہے۔ چنانچہ کارکنانِ مرکز کو شاہی قلعے میں لے جا کر کئی دن زیرِ تفتیش رکھا گیا اور حساب کتاب کے کاغذات کی خورد بینی پڑتال ہوتی رہی۔ لیکن جھوٹ آخر جھوٹ ہی نکلا۔ اس وار کو کارگر نہ پا کر آخر کار جماعت کو راست اقدام (۱۹۵۳ء) کے ہنگاموں کی لپیٹ میں لے لیا۔ مذہبی عناصر کو بدنام کرنے اور ان کو تشدد کی چکی میں پیسنے کے لیے ان ہنگاموں نے جو سنہری موقع پیدا کر دیا تھا، اسے ضائع کر دینا یقیناً ہمارے بزرگوں کی سیاسی بصیرت کی توہین ہوتا۔ انہوں نے پوری جسارت سے مولانا مودودی کو موت کی سزا سنائی جو بعد میں چودہ برس اور سات برس کی متوازی شروع ہونے والی دو سزاؤں میں بدل کر رہ گئی۔ انہوں نے ملک نصر اللہ خاں عزیز اور سید نقی علی اور جماعت اسلامی کی مطبوعات شائع کرنے والے دو چھاپہ خانوں کے مالکوں کو بھی قید کی سزائیں دے ڈالیں۔ انہوں نے پنجاب بھر میں جماعت کے ممتاز سیاسی کارکنوں کو سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا۔ انہوں نے جماعت کی ترجمانی کرنے والے اخبارات کا گلا گھونٹ ڈالا۔ انہوں نے جگہ جگہ سے دفاتر کے کاغذات قبضے میں لے لیے۔ انہوں نے مرکز کے بیت المال سے سوا دس ہزار روپیہ بھی اٹھا لیا۔

رہی سہی کسر پوری کرنے کے لیے جماعت اسلامی کو اضطرابات پنجاب کی تحقیقات کرنے والی عدالت کے سامنے پارٹی بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس تحقیقات نے نہ صرف جماعت پر مالی مصارف کا بھاری بوجھ ڈال دیا، بلکہ کئی مہینوں کے لیے ہماری توجہ اور محنت کا اہم ترین مصرف یہی تحقیقاتی کارروائی بن گئی۔ آج ایک ایسی حسبِ دلخواہ رپورٹ حکومت کے ہاتھ میں ہے جو مخالفِ دین پروپیگنڈے کی مہم میں ایک اچھا ترکش ثابت ہو رہی ہے۔

لیکن جماعت کے سامنے "اسلامی دستور" کا جو بنیادی مسئلہ سات برس سے ہے، اس سے گردشِ زمانہ کے یہ سارے اُلٹ پھیر اسے غافل نہ کر سکے اور سال بھر تک کچلنے پسنے کے باوجود اس کی دعوتی و جماعتی سرگرمیوں میں کوئی خلا واقع نہیں ہو سکا۔ بلکہ اُلٹا اسیرانِ مارشل لاء کی رہائی کی عوامی طلب کے لیے جب وہ میدان میں نکلی تو اس نے دیکھا کہ پورا ملک اس کے ساتھ ہے اور دلوں کے دروازے پہلے سے زیادہ کھلے ہوئے ہیں۔ اس مہم کا یہ واضح نتیجہ تو بہت جلد نکلا کہ حکومت نے مارشل لاء کے قیدیوں کو دو دو چار چار کر کے رہا کر دیا، لیکن دوسری طرف مولانا مودودی کو روک رکھنے کے لیے جو چالیں چلی جا رہی تھیں وہ از اول تا آخر الم نشرح ہو گئیں اور لوگوں میں اس حقیقت کا عام شعور دلائل و شواہد کی بنا پر مستحکم ہو گیا کہ یہ سب کچھ سیاسی انتقام کا ایک مظاہرہ ہے۔ لوگوں کا یہ شعور پچھلے چند ماہ میں جلسوں، قراردادوں اور جلوسوں اور مظاہروں کے ذریعے جس زور شور سے نمایاں ہوا ہے اس کی وجہ سے جماعت اسلامی کے خلاف ایک مرتبہ پھر مسلم لیگی اکابر کے جذبات مشتعل ہو گئے ہیں۔ وہ ناراض ہیں کہ کیوں ہمارے سارے منصوبوں کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا جا رہا ہے اور کیوں چپ چاپ وہ دھاندلی نہیں چلنے دی جا رہی ہے جسے ہم چلانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اوپر اور نیچے تمام سرکاری حلقوں میں برابر یہ سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ جماعت اسلامی کے خلاف سخت کارروائیاں کی جانی چاہئیں۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے کارکن، پولیس کے عہدہ دار، ڈپٹی کمشنر اور سیکرٹری صاحبان (خصوصیت سے پنجاب میں جہاں مارشل لاء کے اسیروں کی مہم کا سب سے زیادہ زور رہا ہے) زبانی اور تحریری ہر طرح سے یہ مشورہ اوپر پہنچا رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کی فوری روک تھام کی جانی چاہیے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ان سرگرمیوں کو روکا جانا چاہیے؟

ناگزیر ہے کہ اس سوال کا ایک جواب فراہم کیا جائے تاکہ رائے عام کے سامنے کسی زیادتی کی توجیہ کی جا سکے۔ کوئی الزام، کوئی شبہ، کوئی اندیشہ، کوئی خطرہ، کوئی غلط فہمی، کوئی بدگمانی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ پاکستان کی مخالفت، جہادِ کشمیر کے خلاف فتویٰ، نہرو گورنمنٹ سے سازباز اور امریکہ کا روپیہ وغیرہ شوشے جس حد تک قابلِ استعمال تھے، استعمال ہو چکے، اور اب

زمانہ جان چکا ہے کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔ پس:-

"اب دانہ گرا اور، کوئی دام بچھا اور"

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "جماعت اسلامی کی سرگرمیوں سے لا اینڈ آرڈر کو خطرہ ہے، بعید نہیں کہ ۱۹۵۳ء کے سے حالات پھر پیدا ہو جائیں!" اب یہ ہے نئی مورچہ بندی! اس مورچہ بندی سے عام حملہ شروع ہو گیا ہے۔ پنجاب میں تو یہ حال ہے کہ جہاں جماعت اسلامی کی طرف سے جلسے یا مظاہرے کا اعلان ہوا جھٹ دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ملتان، لائل پور، میانوالی کے اضلاع پر تو دفعہ ۱۴۴ کا جھنڈا کئی ہفتوں کے لیے گڑ گیا ہے۔ بقیہ اضلاع میں یہ تلوار شہری آزادی کے سر پر بالکل معلق ہے۔ جماعت کے پاکستان بھر کے امیر مولانا اصلاحی پر سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۵ کے تحت پابندیاں لگائی جا چکی ہیں۔ پریس ایمرجنسی ایکٹ کی دفعات ۱ور ۱۲۴ الف کے تحت متعدد مقدمات کارکنان جماعت پر چلائے جا رہے ہیں۔ ایک مقدمہ جماعت کی مجلس شوریٰ کے گذشتہ اجلاس کی قراردادوں کو سائیکلو اسٹائل کر کے اخبارات کو بھیجنے کے سلسلے میں مرکز کے ناظم نشر و اشاعت ارشاد احمد صاحب کے خلاف ابھی ابھی قائم کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ "لا اینڈ آرڈر" کے نام پر ہو رہا ہے۔

ہم ان سطور کے ذریعے دلائل کی حد تک اس مفروضے کو بے سروپا ثابت کر دینا چاہتے ہیں تاکہ زیادتی جو کچھ بھی کی جائے اس کے آگے تاننے کے لیے توجیہ کا کوئی پردہ باقی نہ رہے۔ زیادتی بالکل زیادتی کی حیثیت سے دنیا بھر کے سامنے آئے۔ اس سلسلے میں ہم ایک ایک کر کے وہ تمام حقائق بیان کیے دیتے ہیں جنہیں بہت سے لوگ پہلے سے جانتے ہیں، لیکن جو نہیں جانتے اب وہ بھی جان لیں گے۔

(۱) یہ جماعت اقامتِ دین کے پاکیزہ نصب العین کے لیے سرگرم عمل ہے، اور اس کا بنیادی نظریہ، اس کا دستوری فیصلہ اور اس کی پالیسی کا مستقل جوہر یہ ہے کہ اس پاکیزہ نصب العین کے لیے طریق کار بھی پاکیزہ ہی اختیار کیا جا سکتا ہے جو ٹھیک ٹھیک دینِ برحق کے اصولوں پر مبنی ہو۔

(۲) اس جماعت کا ایک اصل الاصول یہ ہے کہ پیش آئند معاملات میں رائے قائم کرنے فیصلہ دینے اور کوئی عملی قدم اُٹھانے میں دیکھنے کی ایک چیز یہ ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت

کی رہنمائی کیا ہے اور دوسری یہ ہے کہ اسلامی ریاست اور مسلمانوں کا مفاد کس چیز کا تقاضا کرتا ہے۔ ہمارے کام کی تاریخ گواہ ہے کہ آج تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ انہی دو باتوں کو مدِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے پہلی بات یعنی خدا اور رسول کی رہنمائی میں چلنا تو شاید پوری طرح واضح ہے لیکن دوسری بات ایسی ہے کہ جس کے بارے میں کچھ لوگوں کی معلومات دھندلی ہیں، لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہے۔

ہماری رائے میں اسلام کا تقاضا اور اسلامی ریاست اور ملّت کا مفاد دو متضاد اور ٹکرانے والی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ دونوں پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ جو کچھ اسلام کا تقاضا ہے وہی اسلامی ریاست اور ملت کا مفاد بھی ہے، اور اسلامی ریاست اور ملّت کا حقیقی مفاد جو کچھ ہو سکتا ہے، ٹھیک وہی اپنی جگہ اسلام کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ ہمارا یہی وہ شعور تھا جس کے تحت مختلف مواقع پر بہت سے وقتی مسائل جب اُبھرے تو اس کے زیر اثر اجتہادی رائے جو قائم کی گئی وہ سراسر اسلامی ریاست اور ملّت کے مفاد پر مبنی تھی اور ہمارے نزدیک اپنے وقت پر وہی اسلام کا تقاضا تھی۔ مثلاً:-

——— ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کا قصرِ اقتدار منہدم ہو گیا اور متحدہ محاذ نے اس کی جگہ لے لی۔ ہم نے اگرچہ مسلم لیگ کے ہاتھوں بار بار سخت چوٹ کھائے ہیں اور اس سے ہمارا اختلاف نہایت اصولی اختلاف ہے، لیکن مسلم لیگی اقتدار کے اس انہدام کو جو مقابلۃً ایک بدتر قوت کو آگے لے آیا تھا پاکستان کے باشندوں کے حق میں ایک تشویشناک حادثہ قرار دیا۔ دوسری طرف متحدہ محاذ کے غیر متجانس اجزائے ترکیبی اور اس کے انتشار انگیز نعروں کا جائزہ لے کر ضروری سمجھا کہ اس کے خلاف پوری قوت سے کام کیا جائے۔ چنانچہ وہ دن ملک کو بھولے نہ ہونگے جب کراچی میں، اور مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں میں متحدہ محاذ بنانے کے لیے لوگ اینٹ مسالہ جمع کر رہے تھے اور جب کہ ایوانِ اقتدار میں بیٹھے ہوئے مسلم لیگی حضرات کا تختِ جلال لرز رہا تھا تو اس وقت تنہا جماعت اسلامی میدان میں آئی اور یہ تہیہ کر کے آئی کہ مغربی پاکستان میں اس طرح کا متحدہ محاذ نہیں بننے دیا جائے گا، چنانچہ ہفتے بھر میں وہ آندھی چھٹ گئی اور مطلع صاف تھا۔ یہ فیصلہ ہم نے اسلام ہی کی رہنمائی کی روشنی میں اور ملّت کے مفاد ہی کے تقاضے سے کیا تھا، اور اسے

عمل میں لانے کے لیے ہم نے مخالفین کے ان طعنوں کی پروا بھی نہیں کی کہ جماعت اسلامی کا مسلم لیگ سے سمجھوتہ ہو گیا ہے۔

——— اسی سلسلے میں دستوریہ کو توڑنے کا نعرہ بھی بلند ہوا تھا اور اتنے زور سے بلند ہوا تھا کہ دستوریہ کے بہت سے ارکان کے حوصلوں کے جہاز لنگر اور بادبان دونوں سے محروم ہو کر ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ باوجودیکہ اس دستوریہ نے اسلامی دستور بنانے میں بڑی لیت و لعل سے کام لیا تھا، باوجودیکہ اس نے اب تک کے کام میں مضحکہ انگیز رخنے چھوڑے تھے اور باوجودیکہ اس کے ذمہ دار ارکان اسلامی دستور کے تقاضوں کو اپنی الٹی عملی سرگرمیوں سے پامال کر کے قوم کے لیے وجہ تشویش بنتے رہے تھے، لیکن چونکہ اسی دستوریہ نے ——— ردوکد کے بعد سہی ——— ابتدائی مسودۂ دستور میں اسلام کے بہت سے نمایاں اور بنیادی تقاضوں کو جذب کر لیا تھا، لہٰذا جس درجے کے کریڈٹ کی وہ مستحق تھی وہ کریڈٹ اسے دے کر ہم نے اس کو بچا لینا اسلام اور ملت کے مفاد کے لیے ضروری سمجھا۔ اُدھر سے کہا گیا کہ "دستوریہ توڑ دو!" ہم نے جواب میں چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ "یہ دستوریہ نہیں توڑی جائے گی"۔ اور وہ تخریبی نعرہ ختم ہو گیا۔ یہ پارٹ ہم نے کسی دوسری طاقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے ہی اصول و مقصد کی خاطر ادا کیا۔

——— یہی صورت امریکی ایڈ کے مسئلے میں پیش آئی۔ ایک گروہ کا رجحان یہ تھا کہ فی نفسہٖ امریکی ایڈ کی مخالفت کی جانی چاہیے۔ ہم نے اس گروہ کے رجحان کو شکست دے دی۔ اور شرائط معاہدہ سامنے آنے سے قبل خواہ مخواہ کے مخالفانہ اظہارِ رائے سے انکار کر دیا۔ ہم سے جلسوں میں سوالات کیے گئے، ہم سے اخباری نمائندوں نے آ آ کر ردِ عمل معلوم کرنا چاہا، ہمارے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی جانے لگیں مگر ہماری رائے یہی تھی کہ کسی ملک سے امداد لینے کو فی نفسہٖ حرام قرار دے لینا ریاست اور قوم کو لاینحل مشکلات میں مبتلا کرنا ہے، لہٰذا ہم نے بے معنی قسم کی پیشگی مخالفت سے انکار کر دیا۔ پھر جب شرائط معاہدہ سامنے آئیں تو ایک دوسرے گروہ کا یہ رجحان ہمارے سامنے آیا کہ ایڈ کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہیے لیکن ہم نے شرائط میں اسلام اور ریاست اور قوم کے لیے جن پہلوؤں کو خطرناک پایا ایمانداری کے ساتھ

ان کی نشاندہی کر دی۔

——— ٹھیک انہی دو اصولوں پر ہم نے ختم نبوت کی تحریک میں اپنی جماعتی پوزیشن متعین کی یعنی اسلام کے منشا کے مطابق ایک طرف اصل مقصد کی پوری پوری تائید کی، لیکن دوسری طرف تحریک نے جب بھی کوئی موڑ آئین اور اخلاق کے خلاف مڑنا چاہا تو ہم نے کسی ایسی چیز میں حصہ لینے سے دامن بچایا جو اسلام کے اصولوں یا ریاست اور ملت کے مفاد کے خلاف پڑتی ہو۔

ان چند نمایاں مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کسی چیز کی مخالفت یا حمایت کے لیے جب رائے قائم کرتی یا کوئی قدم اٹھاتی ہے تو وہ گروہی کشمکش، جماعتی سیاسیات، مفاد و اغراض اور حریفانہ جذباتیت سے بالاتر ہو کر ایک اصولی کسوٹی اپنے سامنے رکھتی ہے۔

(۳) اس جماعت کے اب تک کے طریق کار کا ایک اصول یہ ہے کہ آئین کی جگہ لاقانونی اور نظم کی جگہ بدنظمی پیدا کر کے کام نہیں کرنا ہے، بلکہ ساری جدوجہد دستور و آئین کی حدود میں نظم کو برقرار رکھتے ہوئے جاری رکھنی ہے۔ غالباً کوئی ادنیٰ مثال بھی قانون شکنی کی ہمارے اب تک کے کام سے اخذ کر کے سامنے نہیں لائی جا سکتی۔ ہمیں جس چیز سے حکماً یا قانوناً روک دیا جاتا ہے اس سے ہم رک جاتے ہیں، جو پابندی لگائی جاتی ہے اسے چار و ناچار گوارا کرتے ہیں، جو حدود عمل حکومت باقی رہنے دیتی ہے انہی حدود عمل میں کام کرتے ہیں۔ کام کرنے والوں کے لیے ہر قسم کی پابندیوں کے اندر بھی ایک نہ ایک دائرۂ کار باقی رہتا ہے اور ہم اپنا کام اسی دائرہ میں جاری رکھتے ہیں۔ یہ گویا ہمارا مستقل مزاج ہے۔ کیا یہ مزاج اس امر کی ایک شہادت نہیں کہ جماعت اسلامی سے لا اینڈ آرڈر کو کبھی کوئی خطرہ پیش نہیں آسکتا۔

(۴) جماعت کے کام میں ہر پہلو سے سنجیدگی اور وقار کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کے جلسوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ نظم اور خاموشی اور باقاعدگی کا یہ ایک اونچا معیار ملک بھر کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تقریروں کا یہ عالم ہے کہ صرف وہ قابل اعتماد ارکان تقریر کرنے کی اجازت حاصل کر سکتے ہیں جن کے خیالات مرتب، جن کا علم کافی اور جن کو زبان اور جذبات پر پوری پوری قدرت ہو،

پھر وہ متعین موضوع پر تقریر کی تیاری کرتے ہیں اور اس حد تک کرتے ہیں کہ فقرے اور الفاظ تک پہلے سے سوچ کر آتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تقریروں میں ایکٹنگ کی جائے، شعر پڑھے جائیں، کہانیاں سنائی جائیں، گھٹیا زبان استعمال کی جائے، بلکہ ذہنی تربیت کے لیے پروفیسروں کی طرح کے معلومات افزا اور مربوط لکچر دیئے جاتے ہیں۔ لوگوں کی یہی تربیت کرنے کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے یہ ریاضی کے لکچر" لوگ سکون کے ساتھ بیٹھ کر سنتے ہیں۔ ان تقریروں میں کبھی کھوکھلی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا، کبھی لوگوں کو اشتعال کا نشہ نہیں پلایا گیا، کبھی ان کو بھڑکانے کی کوشش نہیں کی گئی، اور کبھی انہیں نعروں کے سیلاب میں بہائے جانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

لا اینڈ آرڈر کو توڑنے والوں کے انداز یہ نہیں ہوا کرتے!

(۵) ہمیں دستور اور مارشل لاء کے قیدیوں کے سلسلے میں بے شمار جلوس نکالنے اور مظاہرے کرنے کی بھی ضرورت پیش آئی ہے۔ چنانچہ مطالبۂ دستور کے جو جلوس لاہور اور کراچی اور دوسرے شہروں میں نکالے گئے تھے، وہ جہاں اپنی عظمت اور کثرتِ شرکاء کے لحاظ سے یادگار تھے، وہاں اپنے وقار، نظم اور ڈسپلن کے لحاظ سے بھی تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔ ابھی حال ہی میں راولپنڈی میں بھی جلوس نکالا جا چکا ہے۔ پھر بے شمار مظاہرات ان دنوں میں جابجا ہوتے ہیں۔ کیا کسی ایک جگہ بھی لا اینڈ آرڈر کی نکسیر تک پھوٹی؟

جماعت اسلامی جلوس نکالنے اور مظاہرہ کرنے سے پہلے اپنے بہترین دماغوں کی مدد سے کام کی منصوبہ بندی کرتی ہے۔ اس کا پورا نقشہ بنتا ہے، اس کی حدود طے ہوتی ہیں، اس کے پلے کارڈ اور اس کے نعروں کی عبارت مقرر کی جاتی ہے۔ اس میں شریک ہونے والوں کے لیے باقاعدہ نظم تجویز ہوتا ہے، اس پورے کام کو کنٹرول کرنے کی ذمہ داری نامزد افراد پر ڈالی جاتی ہے، شرکاء کو مختلف پیش آئند صورتوں کے لیے ہدایات دی جاتی ہیں، اتنی تیاری ہو چکتی ہے تو پھر عمل کا قدم آگے بڑھتا ہے۔ یہ اہتمام کر کے جو لوگ گھر سے چلتے ہوں، کیا وجہ ہے کہ ان سے لا اینڈ آرڈر کو کوئی خطرہ لاحق ہو؟

(۶) لا اینڈ آرڈر کے لیے وہ لوگ خطرہ بن سکتے ہیں جنہیں استعمال میں لایا جا سکتا ہو (باقی صفحہ پر)

(بقیہ اشارات)

لیکن آپ نے مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنا کر دیکھ لیا کہ اس انتہائی مظلومی نے بھی جماعت اسلامی کو توازن سے محروم نہیں کیا۔ نظم اور صبر اور حوصلہ جوں کا توں قائم رہا۔ پھر اب وہ کونسی ایسی افتاد یکایک آپڑی ہے کہ جو جماعت سالوں سے صبر کے اسلامی موقف پر جمی چلی آرہی ہے وہ معاً مجنونانہ وار ساری حدود کو پھاند جائے۔

ہم جماعت اسلامی کے اصول کار، اس کی پالیسی، اس کے مزاج اور اس کی عملی روایات کے ان چند پہلوؤں کو سامنے لاکر اربابِ اقتدار سے، سیکرٹریوں سے، انتظامی عہدہ داروں سے اور پورے تعلیم یافتہ طبقے سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی جماعت سے فی الواقع لا اینڈ آرڈر کو کوئی خطرہ ——— موہوم نہیں، حقیقی خطرہ ——— درپیش ہے؟

ہمارے نزدیک اصل معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ابھی یہاں ایک گروہ اسلامی دستور کے موجودہ ناقص مسودے کے خلاف بھی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا ہے، وہ جماعت اسلامی کو عوام میں جوں جوں آگے بڑھتے دیکھتا ہے اس کا پیچ و تاب اور بڑھتا ہے، پھر جب آنے والے انتخابات کی فیصلہ کن گھڑیوں کا تصور کرتا ہے تو اور زیادہ تڑپتا ہے؛ اس کی برہمی اس بات پر اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ مولانا مودودی کو جیل میں رکھ کر اپنے جذبات کی تسکین کے لیے اس نے جن جن حیلوں بہانوں پر اپنی روش کو استوار کیا تھا، مارشل لاء کے اسیروں کی رہائی کی مہم نے پورے ملک میں ان کا تار و پود بکھیر دیا ہے۔ پھر غضب کی ایک لہر سینوں میں یہ دیکھ کر بھی اٹھتی ہے کہ ملک کی تمام اپوزیشن پارٹیاں گھٹی ہوئی ناسازگار فضا میں ایک ایک کرکے سوکھ گئیں مگر تنہا جماعت اسلامی ہے کہ فضا کی ناسازگاریوں کے علی الرغم آگے بڑھ رہی ہے۔ ان ساری چیزوں کا مجموعی ردِعمل ہے جو زور کرتا ہے کہ جماعت اسلامی پر جتنا بھی بس چلے، زیادتی کی جائے۔ اس زیادتی کے لیے توجیہ تیار ہو کر یہ سامنے آئی ہے کہ اس جماعت سے لا اینڈ آرڈر کو خطرہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے

کہ "پاکستان کو خطرہ ہے" اور "مفادِ عامہ کو خطرہ ہے" کی جگہ اب "لا اینڈ آرڈر کو خطرہ ہے" کا نیا نسخہ زیرِ تجربہ آرہا ہے۔ غالباً یہ نسخہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ سے ماخوذ ہے۔

اِن دلائل کے سامنے آجانے کے بعد اگر مسلم لیگی اقتدار اپنی موجودہ روش میں تبدیلی نہیں کرتا تو ہر زیادتی باشندگانِ ملک کی نگاہ میں کھلا کھلا ظلم قرار پائے گی۔ اور ظلم کے مقابلے میں ہمارے پاس ایک ہی جوابی طاقت ہے —— صبر!!

وہ دَور بیت چکا جب ——

اسلام صرف ازکار رفتہ بوڑھوں کا مذہب تھا!

آج اسلام ——

- نوجوانوں کے دل کی دھڑکن

اور

- ان کی رگوں میں دوڑنے والا گرم خون ہے۔

اور

اِن نوجوانوں کے حوصلوں اور ولولوں کا ترجمان

STUDENTS, VOICE.

ہے

قیمت فی پرچہ ۲ دو آنے — سالانہ زرِ تعاون ۲ روپے آٹھ آنے

نمونہ کی کاپی دو آنے کے ٹکٹ بھیج کر

دفتر اسٹوڈنٹس وائس ۲۳ اسٹریچن روڈ کراچی سے طلب فرمائیں